بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اشارات

ایک انسان جب کبھی عالمِ خیال میں دنیا کی سرحد کے اُس پار جھانک کر اُس راستہ کو دیکھتا ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے تو کانپ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ آخر وہ منزل کس قدر کٹھن اور دشوار ہوگی۔ اُس پر سے گذرتے ہوئے کتنی زیادہ احتیاط کی ضرورت پیش آئے گی۔ ذرا سا توازن بگڑنے سے آدمی کس خوفناک گڑھے میں گریگا اور پھر وہاں اُس کا کیا حشر ہوگا؟ یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں خیالات صرف اس ایک تصور کے ساتھ ذہن میں گھومنے لگتے ہیں اور آدمی ان پر گھنٹوں غور کرتا ہے مگر بالآخر معاملہ اس ایک نقطہ پر آکر ختم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے بغیر ان مراحل میں سے کوئی شخص بھی کامیابی کے ساتھ نہیں گذر سکتا۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ کیا اس عالم ناسوت میں بھی کوئی منزل ایسی ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہ سہی مگر خطرات اور مشکلات کے نقطۂ نظر سے "صراط" سے ملتی جلتی ہے تو اسے آسانی سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ راہ تجدید و احیائے دین کی راہ ہے۔ یہ کام بڑا ہی مشکل اور صبر آزما ہے اسکی ذمہ داریاں بڑی ہی شدید اور نازک ہیں۔ اس میں قدم قدم پر انتہائی حزم درکار ہوتا ہے اور توازن میں اگر معمولی سا فرق آجائے تو آدمی تجدید دین کی بجائے تخریب دین کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آدمی جب کبھی اس کام کا تصور بھی کرتا ہے تو کانپ جاتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ جو لوگ اس راہ میں کامیاب و کامران ہوئے ہیں اُن پر رحمتِ باری سایہ فگن رہی اور صرف اسی ذات کے سہارے وہ ان منازل کو طے کر گئے ورنہ یہ کام انسان کے بس سے باہر ہے۔

ممکن ہے یہاں ایک سوال انسان کے ذہن میں یہ پیدا ہو کہ جب اللہ کا کلام اور اُس کے رسولؐ کی سنت ہمارے پاس محفوظ ہے اور خلفائے راشدین اور دوسرے ائمہ اور صلحائے امت کے پورے کارنامے ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں تو پھر اس کام کو اتنا کٹھن اور مشکل کیوں کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب الٰہی اور سنت رسولؐ کی موجودگی اور صحابہ کرامؓ اور ملت کے دوسرے پاکباز لوگوں کی سیرت و کردار کا صحیح ریکارڈ ہمارے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہے، اور اس لیے ہم دینی اعتبار سے اُس طرح کبھی بھی مفلوج نہیں ہوئے جس طرح کہ یہودی اور عیسائی، اور ایشیا کے دوسرے مذاہب کے پیرو مفلوج ہو کر رہ گئے۔ یہ بلاشبہ اسی نعمت کا اعجاز ہے کہ دین کے ساتھ ہمارا رشتہ ہماری ساری کوتاہیوں کے باوجود ہمیشہ قائم رہا ہے اور ہم نے آج تک دوسرے مذاہب کے علمبرداروں کی طرح اپنے دین کو قصۂ پارینہ یا ماضی کی ایک مقدس یادگار یا ایک انجانی یا انہونی چیز کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ اسے ہمیشہ ایک رہنما قوتِ فکر و عمل تسلیم کیا ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ بالکل بجا اور درست، لیکن ان کے ماننے کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وقت کے فتنے بھی کوئی کم خطرناک نہیں ہوتے۔ ان کا طوفان لوگوں کے فکری جہاز کو بے لنگر کر دیتا ہے اور اسے اعتدال اور توازن کی راہ پر لانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ جب کسی امت یا ملت کے دماغ پر زمان و مکان کے تقاضے اس طرح مسلط ہو جائیں کہ اُسے ان کے علاوہ کوئی چیز بھی سمجھ میں نہ آتی ہو، ان حالات میں اُس کے فکر و نظر کو زمان و مکان کی جکڑبندیوں سے آزاد کر کے اسے اسلام کے عالمگیر اور سرمدی پیغام کا علمبردار بنانا بہت ہی کٹھن مرحلہ ہے۔ یہ کام انتہائی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ جبتک ایک انسان اس کام کی مشکلات اور پیچیدگیوں سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوتا وہ احیائے دین کی نازک ذمہ داریوں کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ وقتی مصلحتیں اور وقتی مطالبات کوئی ایسی چیزیں نہیں جنھیں آسانی سے نظرانداز کیا جا سکتا ہو۔ ان کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے اور اس سے نجات دلانے کے لیے کسی فرد یا گروہ کو زبردست جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔

پھر اس معاملہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وقت کے فتنے بہت سی مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں ان میں ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ سوسائٹی کی فضا بحیثیت مجموعی پاکیزہ ہو۔ ملت کی اکثریت پر دینی اثرات نہایت

گہرے ہوں صرف چند مفسد اور شریر انسان بعض ایسے افکار کی اشاعت شروع کر دیں جن سے فضا کے بگڑنے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ ایسے ماحول میں دین کے علمبرداروں کا کام زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اُن کا فرض صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ وہ ان غلط افکار اور باطل نظریات کی اس طریقے سے تردید کریں کہ عوام پر ان کی لغویت واضح ہو جائے۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ معاشرہ تو ہر لحاظ سے صحت مند اور توانا ہو مگر اس میں ایک محدود طبقہ اپنی عیاریوں اور چالاکیوں سے مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائے اور قوت اور طاقت کے بل بوتے پر لوگوں کو غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کرے۔ یہ صورت پہلی صورت سے نسبتاً زیادہ مشکل ہے۔ اقتدار کا یہ خاصہ ہے کہ اگر وہ بُرا ہے تو مقناطیس کی طرح سماج کی ساری برائیوں کو اپنے اردگرد سمیٹ کر ایک زبردست قوت بن جاتا ہے جسے روکنے کے لیے بسا اوقات جان تک کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ لیکن یہاں بھی دین کے جاں نثاروں کی ہمت بندھانے کے لیے بیشمار عوامل موجود ہوتے ہیں۔ انہیں اس بات کا ہر قدم پر احساس رہتا ہے کہ انہیں اکثریت کی تائید حاصل ہے۔ پھر وہ لوگ اس بات کا بھی پوری طرح شعور رکھتے ہیں کہ اگر معاشرہ پر سے اس مفسدانہ اقتدار کے تسلط کو ختم کر دیا جائے تو پھیلی ہوئی برائیاں خود بخود دور ہو جائیں گی کیونکہ ان برائیوں کو ابھی سوسائٹی میں جڑ پکڑنے کا موقع نہیں ملا۔

احیائے دین کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہاں پیش آتی ہے جب برائیاں معاشرہ کے اندر پوری طرح نفوذ کر چکی ہوں، جب غلط افکار و نظریات سے لوگ نہ صرف مرعوب ہی ہوں بلکہ مغلوب بھی ہو چکے ہوں اور وہ طبقہ جسے ملک کی فکری رہنمائی کا منصب حاصل ہو وہ ان باطل عقائد کی ترویج و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد وحید قرار دے لے۔ پھر اس طبقہ کی پشت پر حکومت کے وسائل بھی موجود ہوں اور ریاست کی قوتِ قاہرہ ان باطل نظریات کی بنیاد پر عملاً ایک سوسائٹی کی تشکیل کرنا شروع کر دے۔ ایسے کٹھن حالات میں اعلائے کلمۃ الحق بڑا ہی صبر آزما کام ہے۔ اُن بستیوں میں جہاں رات ابھی اپنے پر پھیلا رہی ہو ہدایت کے دیئے جلانا بلاشبہ ایک قابلِ قدر کام ہے لیکن ایک ایسا ماحول جس پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا چکا ہو اور

لوگ اس تاریکی پر نہ صرف مطمئن ہوں بلکہ بدقسمتی سے وہ اسے روشنی سمجھ رہے ہوں اور اس کو دور کرنے کی ہر کوشش اُن کے نزدیک مذموم خیال کی جائے، پھر وہاں مخالفت کے زبردست طوفان اور مخاصمت کی تند و تیز آندھیاں بھی چل رہی ہوں، وہاں شمعِ ہدایت روشن کر کے پورے ماحول کو اس کی ضیا پاشیوں سے منور کرنا ایک زبردست خدمت ہے۔ اور یہ خدمت جتنی زیادہ قابلِ ستائش، جتنی زیادہ خدا کے ہاں اجر کی مستحق ہے، اُتنی ہی اس کی ذمہ داریاں نازک ہیں اور اس جدوجہد میں بھٹکنے کے خطرات بھی زیادہ ہیں۔

اوپر کی سطور میں جن مختلف صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُن میں کوئی تاریخی ترتیب تلاش کرنا بالکل بے سود ہے۔ جس طرح علم الاقتصاد کے ماہرین نے پوری انسانی تاریخ کو طریقِ پیدائش کے اعتبار سے مختلف ادوار میں منقسم کر دیا ہے، اسی طرح کی کوئی تقسیم تجدید و احیائے دین کے معاملے میں ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے دو تین سو سال بعد کسی ملک میں تیسری صورت درپیش ہو اور اس کے ہزار سال بعد احیائے دین کی کوشش کرنے والوں کو پہلی یا دوسری قسم کی صورتوں کے مسائل گھیرے ہوئے ہوں۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ اب جو لوگ دین کی سربلندی کے لیے کوشاں ہیں چونکہ انہیں نسبتاً مشکل حالات سے سابقہ پیش آ رہا ہے اس لیے اُن کا مرتبہ بھی زیادہ بلند ہے، صحیح نہیں۔ جو شخص تلاطم خیز سمندر کی تند و تیز موجوں سے نبرد آزما ہو اس کے مصائب کا صحیح اندازہ اُس کے علاوہ اور کسے ہو سکتا ہے؟ اسی طرح ایک عہد یا ایک ماحول میں اقامتِ دین کے کام کرنے والوں کی دقتوں کو اس عہد اور اسی ماحول کے رہنے والوں کے سوا کوئی دوسرا پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ماحول اور دوسرے ماحول میں جو فرق پایا جاتا ہے اُس کی اساس محض افکار و نظریات کا اختلاف نہیں ہوتی بلکہ اس میں جذبات و احساسات بھی برابر شریک ہوتے ہیں۔ کسی قوم کے معتقدات بلاشبہ اُس قوم کے ذہنی اور فکری سانچے تیار کرنے میں بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی اثر آفرینی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن جو چیز افراد کو ان سانچوں میں ڈھلنے پر آمادہ کرتی ہے وہ جذبہ اور احساس ہے۔ حیاتِ انسانی جو "شعلۂ مستور" افراد کے دل و دماغ کو گھلا کر ان میں قبولیت کی صفت پیدا کرتا ہے۔ اس کی کیفیت جس طرح افراد کے معاملہ میں داخلی ہے

اسی طرح ماحول کے معاملہ میں بھی سراسر اضافی ہوتی ہے اور باہر کا کوئی فرد جب تاریخ کی چلمن میں سے جھانک کر دیکھتا ہے تو اس کی نگاہ میں افکار و نظریات تو آجاتے ہیں لیکن ان افکار و نظریات سے وابستگی کی کیفیات اُس کی آنکھوں سے ہمیشہ اوجھل رہتی ہیں اور اس بنا پر وہ دوسروں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔

اگر ہر عہد کی جاہلیت محض فکر و نظر کی حد تک دوسرے عہد کی جاہلیت سے مختلف ہوتی تب بھی اُس سے لڑنے کے ہتھیار کبھی ایک سے نہ ہو سکتے تھے لیکن جہاں یہ اختلاف افکار و نظریات سے گذر کر جذبات و احساسات تک پہنچ گیا ہو وہاں ان ہتھیاروں میں یکسانیت تلاش کرنا بالکل عبث ہے۔ جس طرح ہر دور کی گمراہی مخصوص فتنوں کے ساتھ حملہ آور ہوتی ہے اسی طرح اس سے نپٹنے کا طریق بھی بدلتا رہتا ہے کیونکہ حملوں کی نوعیت کے بدلنے سے ان کی مدافعت کی نوعیت کا بدلنا ناگزیر اور لابدی ہے اور اگر یہ تبدیلی نہ کی جائے تو کامیابی کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں۔

جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ ہمارے ہاں کا سارا علمِ کلام اور ہمارے ائمہ اور صلحاء کی تجدیدی کوششیں اس حقیقت کی شاہد ہیں۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اصلاحِ حال کے لیے جو جدوجہد کی اور اموی درباروں میں بڑھتے ہوئے جاہلی رجحانات و اثرات کا جن مختلف طریقوں سے مقابلہ کیا اُن کا انداز امام غزالیؒ کے کام سے الگ اور جداگانہ ہے۔ اسی طرح مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی کارناموں اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی اقامتِ دین کی کوششوں میں گو نوعی فرق نہ سہی لیکن عملی فرق ضرور پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ جاہلیت ہر عہد میں فتنوں کے رنگا رنگ لباس اوڑھ کر جلوہ گر ہوتی رہی ہے اور اس سے مقابلہ کرنے والوں کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں، اس لیے اس کا رستہ روکنے کے لیے یہ ناگزیر رہا ہے کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق جدوجہد کی جائے چنانچہ آج ہم جاہلیت کے جن مختلف فتنوں میں گرفتار ہیں اور انہوں نے ہماری زندگی کا جس طریق سے احاطہ کر رکھا ہے، جب تک ہم انہیں پوری طرح سمجھ نہیں پاتے اسوقت تک جاہلیت کے ساتھ کوئی لڑائی بھی کامیابی کے ساتھ لڑی نہیں جا سکتی۔

اس ضمن میں پہلی چیز جس کا ذہن نشین کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آج کے اس دور میں جاہلیت ہم سے زندگی کے صرف ایک مورچے یا محاذ پر نبرد آزما نہیں بلکہ یہ لڑائی حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں میں ہے۔ پھر یہ تصادم اگر ایک طرف افکار و نظریات کی دنیا میں پایا جاتا ہے تو دوسری طرف عمل کا میدان بھی اس سے خالی نہیں۔ یہ فتنہ جس سے اس وقت ہمیں مقابلہ درپیش ہے اشتراکی فلسفہ کی ہی کوئی گمراہی نہیں۔ اِس کا تعلق زندگی کی گہرائیوں سے ہے، اس کی جڑیں انسان کے قلب و دماغ میں پیوست ہیں اور اسکی شاخیں حیاتِ انسانی کی ساری وسعتوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لیے جب تک اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکا نہیں جاتا دینِ حق کو زندگی میں نافذ کرنے کی کوششیں پوری طرح بارآور نہیں ہو سکتیں ایک تہذیب کو مٹانے کے لیے ایک تہذیب ہی اس کے مقابلے میں لانی پڑتی ہے اور ایک جاہلی تمدن کو تمدن کی ہی قوت سے مسمار کیا جا سکتا ہے۔

پھر ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ سائنس کی ایجادات و انکشافات نے نہ صرف فکر و نظر کے زاویوں کو بدلا ہے بلکہ انسانی عمل کے دائروں کو بھی کافی حد تک متغیر کر دیا ہے۔ زمان و مکان کے سمٹ جانے سے حیاتِ انسانی کے مختلف شعبے باہم ایک دوسرے سے اسقدر قریب ہو گئے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ آپ اگر زندگی کے ایک شعبے میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو جب تک سارے شعبوں کو اُس کے مطابق تبدیل نہیں کر لیا جاتا یہ انقلابی کوشش کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس کے ساتھ ساتھ ریاست کا دائرۂ عمل بھی اب اس قدر پھیل گیا ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ اس کے اثر و نفوذ سے آزاد نہیں رہا۔ اور یہ زبردست قوت جس کے ذرائع اور وسائل پہلی ریاستوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں، جاہلیت پھیلانے کے لیے پوری طرح محوِ عمل رہتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جاہلیت اگرچہ پیدا تو اب بھی شیطانی دماغوں ہی میں ہوتی ہے مگر اب اس کی نشر و اشاعت کا سب سے مؤثر ذریعہ ریاست ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اس لیے ان بدلے ہوئے حالات میں جاہلیت کا مقابلہ کرنے کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں: یا تو ریاست کے دائرۂ اختیار کو کم کر دیا جائے، یا خدا کے آزاد بندوں کے لیے اس دنیا میں ایک ایسی سرزمین تلاش کی جائے جو کافرانہ نظامِ زندگی کے اثرات سے نہ صرف آزاد ہو بلکہ

مستقبل میں بھی اُس کی دستبرد سے بالکل محفوظ و مامون رہ سکے، یا پھر آخری صورت یہ ہے کہ جاہلی نظام کے اندر ہی رہتے ہوئے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور اس کو شکست دینے کے بعد ریاست کے رُخ کو صحیح راہ پر موڑ دیا جائے۔ جس دَور میں سے ہم گزر رہے ہیں اس میں تیسری صورت کے سوا کوئی اور صورت ممکن نظر نہیں آتی۔ یہ راہ بلاشبہ سخت دشوار ہے مگر اس کے علاوہ اقامتِ دین کے لیے کوئی چارہ کار بھی باقی نہیں رہا ہے۔

اس منزل کی جو مشکلات ہیں اُن میں سے بعض تو وہ ہیں جو ظاہر و باہر ہیں یعنی جاہلیت کی حفاظت اور پاسبانی ریاست کا قہر و جبروت کرتا ہے اور اس کے نفاذ کے لیے اُس کے وسائل کام میں آتے ہیں لیکن اس کی بعض مشکلات ایسی بھی ہیں جو اکثر و بیشتر نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں اور بسا اوقات خدمتِ دین کے سچے جذبے سے سرشار لوگ بھی بعض ایسی بے اعتدالیاں کر بیٹھتے ہیں جن سے دین کو فائدہ پہنچنے کی بجائے اسے شدید نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ہم یہاں بعض ایسی دقتوں کی طرف ہی اشارہ کرتے ہیں۔

ہمارے اس دَور میں جب کوئی شخص اقامتِ دین کا نیک اور مقدس ارادہ لیکر اٹھتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ جاہلیت نے پوری زندگی پر تسلط قائم کر رکھا ہے۔ اُس نے صرف لوگوں کے افکار و نظریات اور اعمال و افعال کو متاثر نہیں کیا بلکہ سوچنے اور سمجھنے کے سارے انداز یکسر بدل دیئے ہیں پہلے تو ایسا شخص اس تسلط کی ہمہ گیری دیکھ کر گھبراتا ہے مگر جب ہمت کر کے راہِ حق کی طرف قدم اٹھاتا ہے تو یہ سوچ نہیں پاتا کہ آغاز کس طرح کرے۔ وہ غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرتا ہے کہ چونکہ فساد کی اصل جڑ خالق و مخلوق کے مابین رشتہ کی خرابی میں ہے اس لیے سب سے پہلے اس رشتہ کو صحیح کرنا چاہیے۔ لیکن اُسے فوراً ہی اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ دورِ حاضر کی جاہلیت نے خالق اور مخلوق کے درمیان تعلق میں جو خرابی پیدا کی ہے وہ کسی مافوق الطبیعی احساس کا نتیجہ نہیں بلکہ محسوسات کی کرشمہ سازی ہے اس لیے وہ مجبوراً مابعد الطبیعیاتی مسائل کو چھوڑ کر اُمورِ دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جاہلیت نے انسانیت پر جو مظالم ڈھائے ہیں اُنکی نشاندہی کرتا ہے اور لوگوں کے ذہن میں اس حقیقت کو اُتارنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ برائیاں جنھیں وہ اس عالمِ مادی

میں دیکھ رہے ہیں یہ دراصل اپنے مالک اور خالق کو صحیح طور پر نہ پہچاننے کے لازمی نتائج ہیں۔ پھر اس کے مقابلے میں وہ مثبت طور پر ایک صحیح نظریۂ زندگی بھی پیش کرتا ہے تاکہ لوگ اُسے قبول کر کے جاہلیت کی پھیلائی ہوئی لعنتوں سے نجات حاصل کریں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک داعی الی الحق کو سب سے زیادہ مشکل پیش آتی ہے۔ ایک طرف وہ یہ دیکھتا ہے کہ جس نظامِ حیات کا وہ علمبردار ہے اُس میں اگرچہ اس دنیا کی بھلائی کا بھی سامان موجود ہے لیکن اس بھلائی کا حقیقی سرچشمہ چند ما فوق الطبیعی معتقدات ہیں اور خیر کی یہ کھیتی اُسی صورت میں ہری بھری ہوتی ہے جب اُسے ایمانیات کے ان روحانی چشموں سے سیراب کیا جائے۔ مگر دوسری طرف حق کی دعوت دینے والا اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اُس کا مخاطب جو محسوسات کا رسیا ہے اُس وقت تک کوئی چیز قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جب تک کہ اُس کے سامنے امورِ دنیا کی اصلاح کا کوئی بہتر پروگرام نہ رکھا جائے۔ اس لیے وہ بیچارا اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ فریقِ مخالف کو محض سمجھانے کی خاطر اپنے نظامِ حیات کو جو بنیادی طور پر ایک روحانی نظام ہے دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی افضل و اکمل ثابت کرے۔ اس معاملے میں بڑے ہی توازن اور احتیاط کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تجدیدِ دین کی یہی "پل صراط" ہے۔ اگر وہ اپنے مخالف کو اپنے نظریۂ حیات کی محسوس برکتوں سے آشنا کرنے کے بعد اسے اس غیر مرئی ذات تک پہنچا دیتا ہے جو اس سارے خیر کا منبع اور مبدا ہے تو وہ کامیاب ہے لیکن اگر وہ بدقسمتی سے خود اپنے آپ کو ہی اس مادی دنیا کے غم و پیچ میں ایسا اُلجھا لیتا ہے کہ فلاح و کامرانی کا اصل سرچشمہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے تو یہ سب سے بڑی ناکامی ہے۔

تجدید و احیائے دین کی مقدس کوششوں کی جو تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے اُس پر ایک نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ بعض بڑے بڑے نیک اور بے نفس لوگ کس طرح ناکامی کا شکار ہوئے۔ انھوں نے وقت کے مسائل سے نپٹنے کے لیے اُسی عہد کے تقاضوں کے مطابق علمِ کلام تیار کیا اور اس سے کسی قدر مفید کام بھی لیا۔ لیکن شومئی قسمت کہ اپنی بات کو زیادہ مؤثر اور دلنشیں بنانے کے لیے حدِ اعتدال سے گذر گئے اور اپنی آواز کو نوائے وقت کے ساتھ اتنا ہم آہنگ کر دیا کہ وہ اُسی میں گم ہو کر رہ گئی اور اس کا کوئی الگ وجود بھی باقی نہ رہا۔ بلکہ

ہاں امام غزالیؒ نے بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق باتیں کیں اور سرسید نے بھی یہی خدمت سرانجام دی لیکن دینی نقطۂ نظر سے ان دونوں کے اثرات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ امام صاحب کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور فلسفۂ یونان کا طلسم ٹوٹا اور اس کی جگہ لوگوں نے احکامِ الٰہی اور سنتِ رسولؐ کی طرف توجہ کی۔ یہ اُس خادمِ دین کا اتنا بڑا احسان ہے کہ ملتِ اسلامیہ کبھی بھی اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس سرسید مرحوم خواہ دنیاوی خدمات کے اعتبار سے کتنے اونچے ہی کیوں نہ ہوں لیکن دینی نقطۂ نظر سے انہوں نے متاعِ امت کا اتنا عظیم نقصان کیا کہ اسے آسانی کے ساتھ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اس بارے میں یہ بھی تسلیم ہے کہ سرسید کی نیت خراب نہ تھی۔ انھوں نے جو کچھ کیا اصلاح کے ارادے سے کیا۔ لیکن دیکھیے کہ تجدیدِ دین کے معاملہ میں معمولی بے احتیاطی نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور اُن کی اس بے ارادہ لغزش نے امتِ مسلمہ میں کن فتنوں کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں اس موضوع پر کسی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ لیکن اتنی بات ضرور ذہن نشین رہے کہ سرسید نے جس عہد میں آنکھ کھولی اُس میں سائنس کی ترقیوں نے انسانی نگاہ کو خیرہ کر رکھا تھا اور اس وجہ سے نیچر اور قواعدِ طبیعی صداقت کا معیار قرار پا چکے تھے۔ سرسید نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کا پرانا علمِ کلام اس نئے دور میں کارآمد نہیں ہو سکتا تو انہوں نے اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے قرآن میں سے قوانینِ فطرت کی یکسانیت اور ہم آہنگی تلاش کی۔ یہ کام بڑا ہی اچھا اور مفید تھا اور دین کے لیے قوت اور طاقت بن کر مغربی نظریات کی یلغار کو روک سکتا تھا لیکن اسے مسلمانوں کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ مرحوم کی آنکھیں قوانینِ فطرت میں ایسی اُلجھیں کہ ان کے خالق کی قوتوں کا انہیں احساس باقی نہ رہا۔ چنانچہ انہوں نے سارے دین کو اندھی بہری فطرت کے مطابق ڈھال دیا۔ معجزات کا جو خداوند تعالیٰ کی قوت کے زندہ مظاہر ہیں، سرے سے انکار کر دیا، یا ان کی اس طرح تاویل کی کہ ان میں اعجاز کی شان باقی نہ رہی۔ جنت و دوزخ اور عقائد مابعد الطبیعی جو اسلام کی بنیادیں ہیں سب متزلزل ہو گئے اور اسلام اُن معنوں میں فطرت اللہ سمجھا جانے لگا جن معنوں میں نیچر کا لفظ بولا جاتا ہے۔

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں ہمیں بھی قریب قریب اسی قسم کے مسائل درپیش ہیں اور اُن کے حل کے لیے

ہمیں بھی انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ مغربی افکار و نظریات نے جن کی بنیاد سراسر مادی ہے ایک تہذیب، ایک تمدن یا دوسرے لفظوں میں ایک نظامِ حیات کا روپ دھار لیا ہے۔ اس وجہ سے طرزِ سلطنت اور رفاہِ عام کے طور طریق ہی ایک دین کی صداقت کے معیار قرار پائے ہیں۔ یہ سارے معیارات اپنی نوعیت کے اعتبار سے عالمِ محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے دین کا جو داعی باطل کی جگہ حق قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ "امورِ دنیا" سے بحث کرے اور اپنے نظریہ کی وضاحت اُسی زبان اور اصطلاح میں کرے جو ان "دنیا پرستوں" کے لیے قابلِ فہم ہو اور پھر اُن کے نظامِ حیات کے اندر جو جو اسقام پائے جاتے ہیں اُن کی نشاندہی کر کے انہیں یہ بتائے کہ یہ ساری خامیاں کوئی وقتی اور اتفاقی چیزیں نہیں بلکہ اُس نظریہ کے لازمی اجزاء ہیں جو انھوں نے زندگی کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ اس لیے جب تک وہ اپنے مالک اور خالق کے ساتھ اپنے تعلقات درست نہیں کرتے اُس وقت تک اُن کے مصائب دُور نہیں ہو سکتے۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کی ذہنی فضا میں آدمی کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ عالمِ محسوسات کے مقدمات کو اس طریق سے ترتیب دے کہ ذہن خود بخود غیر محسوس ذات کی طرف منتقل ہو جائے۔ محسوس سے غیر محسوس کی طرف انتقالِ ذہن کا یہ عمل بڑا مشکل اور انتہائی احتیاط کا طالب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محسوسات کی بنیاد پر جو تمدن اس وقت قائم ہے اس سے زیادہ انسانی خواہشات کو تسکین دینے والا کوئی نظام نہیں، اس لیے عام انسانوں کے لیے یہ سب سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔ جو نظریہ حیات کسی چیز کی صداقت کے لیے صرف حواس کی شہادت کا طلبگار ہو اور جس میں اُن چیزوں کے لیے کوئی معمولی سے معمولی گنجائش بھی باقی نہ رہے جو حواس سے ماوراء ہوں وہاں اس طرح کے مقدمات قائم کرنا کہ انسانی ذہن ایک ایسے نظامِ حیات کی طرف متوجہ ہو جائے جس میں خدا، وحی، الہام، حشر و نشر جیسی غیر مرئی چیزیں بطورِ ایمانیات تسلیم کرنی پڑیں۔ خاصا دشوار اور دقّت طلب کام ہے۔

پھر اس کام میں مشکلات کے علاوہ لاتعداد خطرات بھی ہیں اور ان میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ بعض اوقات دینِ حق کے علمبردار تعلیماتِ الٰہی کو قابلِ فہم بنانے کے لیے ان کی اس انداز سے تشریح و تعبیر

شروع کر دیتے ہیں کہ وہ رائج الوقت حِسی نظام کی ہی ایک بہتر اور ترقی یافتہ صورت معلوم ہونے لگتی ہے اور اس طرح ایک عالمگیر نظامِ فکر و عمل جو محسوسات کی دنیا سے بحیثیت تو بلاشبہ کرتا ہے مگر جس کی بنیاد خالص روحانی ہے، جو زمانی اور مکانی قیود سے سراسر آزاد ہے، وہ وقتی تقاضوں کی جکڑ بندیوں میں گرفتار ہو کر محض ایک مادی نظام بن کے رہ جاتا ہے۔ دینِ حق کو وقتی مصلحتوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس کا حلیہ اس طرح سے بگاڑا جاتا ہے کہ جاہلیت اور اسلام کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اسلام کی اس مادہ پرستانہ تعبیر میں عمل کی بنیاد حسی تمدن کی طرح مصالح یا ذاتی اور قومی منافع قرار پاتی ہے۔ خوف خدا یا احتسابِ آخرت جو درحقیقت کسی الہامی دین میں عمل کے سب سے بڑے محرکات ہیں اُن کو یا تو محض اعتباری باتیں کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے یا پھر اُنہیں اس طرح توڑ موڑ کر پیش کیا جاتا ہے کہ انسانی زندگی میں اُن کی اثر آفرینی باقی نہیں رہتی۔ سر سید کی تحریکِ اصلاح سے لیکر فتنۂ انکارِ حدیث تک ہمارے ملک میں متجددین نے تاویلات اور تحریفات کے جو عجیب و غریب شاہکار پیش کیے ہیں وہ سب اُسی ذہنیت کے زندہ مظاہر ہیں۔ ان میں اسلام کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ سراسر ایک مادی تحریک کا پتہ دیتی ہے اور اُس کو دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام بھی ایک طرح کا حسی تمدن ہے۔ ان دونوں کے مابین اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہی کہ مادیئین خدا کے وجود کا کھل کر انکار کرتے ہیں لیکن یہ حضرات اُس کے وجود کے کسی حد تک قائل ہیں خواہ اس اقرار کا عملی زندگی سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ اس غلط طرزِ فکر نے دین کے معاملہ میں جو گل افشانیاں کی ہیں اُن کا تذکرہ بے فائدہ ہے۔ کہیں قوم کی معاشی خوشحالی کے لیے سود اور انشورنس کے جواز کی راہیں نکالی جارہی ہیں، کہیں امتِ مسلمہ کے ذوقِ جمال کی تسکین کے لیے تصویر کشی اور پیکر تراشی اور رقص و سرود کے حق میں فتوے صادر ہو رہے ہیں اور کہیں بہتر معیارِ زندگی کے حصول کے لیے ضبطِ تولید کے حق میں دلائل فراہم کیے جارہے ہیں۔ ان ساری کوششوں کے پس پردہ اگر جھانک کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف وقت کا جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور وہ دین جو سارے ادیان کی قوت اور طاقت کو ختم کر کے خود اپنی فرمانروائی قائم کرنے کے لیے دنیا میں نازل کیا گیا تھا اب بعض نااندیش لوگوں کی حماقت سے مغربی تحریکات کا ضمیمہ دار بن گیا

بے جا نہ ہوگا کہ اگر بات ختم کرنے سے پیشتر چند باتیں دین کے اُن مخلص خادموں سے بھی کر دی جائیں جو اسلام کو ہر قسم کی دستبرد سے بچانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ دورِ حاضر میں اسلام کے گرد فتنوں کے ہجوم نے ان لوگوں کو بہت زیادہ محتاط اور حساس بنا دیا ہے۔ وہ جہاں ذرا سی کوئی جنبش دیکھتے ہیں تو فوراً چونک جاتے ہیں۔ لیکن انہیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ احتیاط اپنی جگہ کتنی ہی صحیح اور درست سہی لیکن اس میں اور وہم پرستی میں بہت زیادہ فرق ہے اور یہ بیماری بھی اپنی جگہ کچھ کم خطرناک نہیں۔ اس سے بسا اوقات آدمی اپنے گھر کے آدمیوں کو ہی اپنا دشمن سمجھ بیٹھتا ہے اور شک و شبہ کی اس ہیجانی کیفیت میں انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتا ہے۔ اگر دین کے معاملہ میں ایک طرف لاپروائی مہلک چیز ہے تو دوسری طرف وہمی پن بھی قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ نے ہم سب کو نورِ بصیرت دیا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم صحیح اور غلط کوششوں کے درمیان فرق کر سکیں۔ دو مختلف نقطہائے نظر کے خارجی مظاہر میں کہیں کوئی مشابہت دیکھ کر اُن پر ایک ہی حکم لگا دینا پرلے درجے کی بے احتیاطی ہے۔ زندگی میں جو مختلف نظامہائے حیات پائے جاتے ہیں ان کی حیثیت ریلوے جنکشن کی سی ہے جس میں سے کئی ایک لائنیں نکلتی ہیں۔ کچھ چند میل کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہیں۔ کچھ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ لیکن ان کی منزلیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔ اس میں بے شمار تمدن ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پروان چڑھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں کئی چیزیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص محض چند باتوں میں مشابہت دیکھ کر یہ فیصلہ صادر کر دے کہ یہ سارے ایک ہی ہیں تو اس کی بے بصیرتی میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ چند معاملات میں تمدنی مظاہر کا اتحاد اُن بنیادی افکار کے اتفاق کا ہم معنی نہیں ہوتا جن کے دراصل یہ عکس ہیں۔ اصل اور فیصلہ کن چیز وہ نظریات ہیں جو انہیں معرضِ وجود میں لاتے ہیں۔ آپ اگر ان مظاہر کا گہرائی میں اتر کر تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں ظاہری اتفاق و اتحاد کے باوجود ایک زبردست بُعد پایا جاتا ہے کیونکہ ایک نظامِ تمدن اپنے مختلف شعبوں کے درمیان جو رشتۂ تناسب قائم کرتا ہے

وہی حقیقت میں اس کی جان ہوتا ہے اور یہی چیز اُسے انفرادیت بخش کر دوسروں سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے لہٰذا چند باتوں میں اتفاق و اتحاد اساسی اتحاد کی علامت نہیں ہو سکتا۔

ہم نے اس امر کی وضاحت اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ اس کو نہ جاننے کی وجہ سے بعض بڑے نیک لوگ بھی عجیب و غریب غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یہاں اُن لوگوں سے کوئی سروکار نہیں جو ہر اُس آواز کے مخالف ہیں جو اُن کے حلقے سے باہر بلند ہوتی ہے یہاں ہمارے مخاطب وہ طبقہ ہے جو دین کے معاملے میں بڑا مخلص ہے۔ دین کے ساتھ اس کی محبت ہر اشتباہ سے بالا ہے مگر صورتِ حال کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ اکثر اوقات ایسی باتیں کر جاتا ہے جو مفید اور کارآمد ہونے کی بجائے نقصان دہ ہوتی ہیں۔

خدا کے یہ پاکباز بندے جنہیں جدید تہذیب و تمدن کی ہوا تک بھی نہیں لگی ہوتی جب یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی فرد یا گروہ ایک الہامی مذہب کی صداقت پر "امورِ دنیا" کو بطور گواہ پیش کر رہا ہے تو وہ مضطرب ہو کر فوراً اچھل اُٹھتے ہیں کہ دیکھیے اسلام کو ایک مادی تحریک بنایا جا رہا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے اس فیصلہ کا خود ہی غور سے تجزیہ کریں تو انشاء اللہ ان کی غلطی اُن پر خود بخود واضح ہو جائیگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید ذہن کو سمجھانے کے لیے ایسے مسائل سے ہی بحث کا آغاز کرنا پڑتا ہے جو محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ایمانداری سے یہ دیکھیے کہ کیا محسوسات کے انہیں مقدمات کو ترتیب دے کر ذہن کو فوق الطبیعی حقائق تسلیم کروانے پر آمادہ نہیں کیا جاتا؟

ان حضرات کے یہ خدشات اُن لوگوں کے حق میں صحیح ہیں جو یا تو فوق الطبیعی حقائق کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں یا اُن کی کوئی ایسی تاویل کرتے ہیں جو محسوسات کے مطابق ہو۔ لیکن جو لوگ خدا، وحی، الہام، جنت، دوزخ، فرشتے اور معجزات کو نہ صرف جوں کا توں مانتے ہیں بلکہ انہیں حیاتِ انسانی میں بطورِ اساس تسلیم کرتے ہیں اور ان کی کوئی مادی تعبیر نہیں کرتے انہیں یہ کہنا کہ یہ لوگ اسلام کو ایک

مادّی تحریک بنا رہے ہیں ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

پھر بعض حلقوں کی طرف سے یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ یہ "شارحین اسلام اپنی ہمہ دانی کے زعم میں دین کو جدید نظریات و افکار کا ملمّع بنا رہے ہیں"۔ میں ان حضرات سے پوچھتا ہوں کہ کیا جدید نظریات و افکار کی تردید اُن کے نزدیک ملمّع بنانا ہے۔ کیا آپ اُن لوگوں پر یہ الزام لگانے میں حق بجانب ہیں جو سرمایہ پرستی کے اس دَور میں سود اور انشورنس کو حرام سمجھیں، جو قوم پرستی کے اس عہد میں بین الاقوامیت کے علمبردار ہوں، جو فحاشی اور بدمعاشی کے اس طوفان میں عفت اور حیا پر زور دیں اور بے پردگی کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب میں پردے کی حمایت پر کمربستہ ہوں اور جو ضبطِ تولید جیسے معاشی فلسفہ کو ذاتِ باری تعالیٰ کے اس وعدہ پر مسترد کر دیں:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (الانعام-۱۹)

اور اپنی اولاد کو افلاس کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔

پھر یہ بزرگ اپنے سارے علم و فضل کے باوجود اُن طریقوں کو بھی سمجھ نہیں پاتے جن کو کام میں لا کر اسلام کو ایک وقتی اور مادّی تحریک بنایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ذرا سوچیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایک ضروری حربہ یہ ہے کہ دین میں سنتِ رسول کی حجیت کو ختم کر دیا جائے کیونکہ اسے ختم کرنے کے بعد ہی ایک انسان کو قرآن مجید میں من مانی تاویلات کرنے کی آزادی میسّر آ سکتی ہے اور اس طرح تعلیماتِ الٰہی کو موڑ توڑ کر انہیں وقتی تقاضوں کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جو لوگ دین میں قرآن کے ساتھ سنتِ رسول کو بھی حجت تسلیم کرتے ہوں وہ اسے کوئی مادّی یا وقتی تحریک نہیں بنا سکتے کیونکہ جب کوئی شخص اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی ہمارے مطاع اور متبوع ہیں اور انہوں نے جو کچھ فرمایا اور کیا اُس کی پیروی اور پابندی ہم پر لازم ہے اور کسی فرد، گروہ یا "مرکزِ ملت" کو اس میں تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں تو وہ لامحالہ اسلام کی

اُسی شکل کا قائل ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے متشکل فرمایا تھا۔ اس طرزِ فکر کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس سانچے ہی کو اپنے لیے آئیڈیل سمجھتا ہے جس میں حضورؐ کی ذاتِ اقدس نے فکر و عمل کے طریقوں کو ڈھالا تھا۔ اس ذہنی پس منظر کے ساتھ اسلام کو ایک مادی تحریک بنانا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب محال ہے اور اس کی جسارت وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو انتہائی درجہ کا ڈھیٹ ہو یا پرلے درجے کا خائن۔ اور اس جرأت کی کسی ایسے فرد سے توقع نہیں کی جا سکتی جس کے دل میں خدا اور خلق کی کچھ بھی شرم موجود ہو۔

رسالہ ترجمان القرآن

کے خریداروں اور ایجنٹوں سے گذارش ہے کہ منی آرڈر بھیجتے وقت یا خط و کتابت کے سلسلے میں اپنے نمبر خریداری یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور تحریر کیا کریں۔ نئے خریدار اپنے مکمل پتے کے ساتھ جس ماہ سے وہ رسالہ جاری کروانا چاہیں اس کا حوالہ بھی منی آرڈر کوپن پر تحریر فرما دیا کریں۔

مینجر ترجمان القرآن لاہور